شیطان یا فرشتہ

مولانا طاہر القادری کی شخصیت کا ایک غیر جانبدارانہ مطالعہ

شیطان یا فرشتہ

فرید انور

تنویر پبلشرز، شاہراہ قائد اعظم لاہور

ایک مشہور ہفت روزہ جریدے کے ڈپٹی ایڈیٹر نے، جس نے ۱۹۸۶ء میں پہلی بار علامہ طاہر القادری سے ایک طویل انٹرویو کر کے ایک الف لیلوی داستان سے عام لوگوں کو روشناس کرایا تھا، گذشتہ ماہ اس کی شخصیت کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون لکھا --- جب اس نے یہ مضمون اشاعت کے لئے جریدے کے ایڈیٹر کے سامنے پیش کیا تو ایڈیٹر نے اس تحریر پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور یہ کہتے ہوئے اسے اپنی میز کی دراز میں پھینک دیا کہ اگر اس نے یہ من و عن شائع کر ڈالی تو طاہر القادری کے فدائین مضمون نگار کو دوسری دنیا کا راستہ دکھا دیں گے ---- کئی ہفتے گزر جانے کے باوجود یہ انکشاف انگیز اور دلچسپ تحریر مدیر کی میز کے دراز میں پڑی ہے - یہ وہی ایڈیٹر ہے، جس نے علامہ طاہر القادری کی شخصیت کا بت تراشنے کے لئے اپنے ماہوار جریدے میں درجنوں صفحات پر پھیلے ہوئے ستائشی انٹرویو شائع کئے تھے اور جو ڈیڑھ سال پہلے 'پاکستان عوامی تحریک کے پہلے عوامی جلسہ عام کے موقع پر اس شخص پر نکتہ چینی کرنے والوں سے الجھتا رہا۔

مذکورہ مضمون کا خالق پاکستان کے اخبار نویسوں میں شاید طاہر القادری کو سب سے زیادہ جاننے والا شخص ہے -- کئی سال اس اخبار نویس کا طاہر القادری سے قریبی رابطہ رہا ہے ' حالانکہ وہ دوسرے لیڈروں کے برعکس صحافیوں سے خوشدلانہ گپ شپ کرنے والا شخص نہیں ہے - شاید یہی وجہ تھی کہ جب گذشتہ سال اس نے ایک پندرہ روزہ جریدہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو علامہ نے اس جواں سال

اخبار نویس کو پر کشش معاوضے پر ادارت کی پیشکش کی۔ سیاسی طور پر معتدل مزاج اور غیر وابستہ اخبار نویس نے یہ پیشکش قبول کرلی۔ بتایا جاتا ہے اسے اپنی سابقہ ملازمت کے مقابلے میں اڑھائی گنا معاوضہ پیش کیا گیا اور اس کا منصب بھی پہلے سے بہتر تھا، لیکن وہ چند ماہ بعد ہی وہ اپنے پرانے دفتر میں لوٹ آیا۔ وہ حیران اور ناخوش تھا اور اس نے کہا کہ وہ ایک کتاب لکھے گا، جس میں ساری داستان بیان کردی جائے گی۔۔۔ ان دنوں وہ یہ کتاب لکھ رہا ہے اور جیسا کہ اس کا مزاج ہے وہ مبالغے سے بچتے ہوئے پوری کہانی کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔۔ اگر وہ اپنی کچل دینے والی مصروفیات میں سے وقت نکال کر یکسوئی اور سلیقے سے یہ داستان بیان کرسکا تو یہ پاکستان کی صحافتی تاریخ کا ایک یادگار تجربہ ہوگا۔

اخبارات کے رپورٹنگ یا میگزین سے متعلق شعبوں میں جب کوئی شخص علامہ طاہر القادری کے بارے میں لکھنے کے ارادے کا اظہار کرے تو اکثر یہ بات مزاحیہ انداز میں کہی جاتی ہے کہ جو کوئی علامہ صاحب کے حضور گستاخی کا مرتکب ہوگا، اسے مذہبی لیڈر کے فدائین اٹھا لے جائیں گے۔ اس طرح کے مزاحیہ جملوں کی تہہ میں ہمیشہ خوف کی ایک لہر موجود ہوتی ہے۔

کچھ عرصہ پہلے علامہ کے درجنوں مسلح اور چیختے چلاتے کارکن اخبارات کے دفاتر میں جا گھسے تھے اور انہوں نے مطالبہ کیا تھا کہ ان کے لیڈر کی خبر چھ کالمی شہ سرخی کے ساتھ شائع کی جائے۔ اس کے بعد سے اخبار نویس خاص طور پر محتاط ہیں۔ وہ

گذشتہ کئی سال سے وہ مختلف جماعتوں کے حملوں کا شکار ہوتے رہے ہیں۔

لیکن ہر ایسے واقعہ کے پیچھے ہمیشہ کوئی تنازعہ موجود تھا ــــــ اس کے برعکس چند ماہ پہلے جب علامہ طاہر القادری کے فدائین، رائفلوں سے مسلح ہو کر اخبارات کے دفاتر میں داخل ہوئے تو کوئی جھگڑا موجود نہ تھا۔ وہ صرف نمایاں خبر چھپوانے کے لئے یہ حربہ استعمال کر رہے تھے۔ اس روز اخبارات کے نام علامہ کا پیغام بے حد واضح تھا، وہ ہر قیمت پر اپنا چرچا چاہتا تھا حتیٰ کہ وہ اس کی بھاری قیمت ادا کرنے پر تیار تھا۔

علامہ کی مختصر سی عوامی زندگی کی ساری کامیابیاں پروپیگنڈہ ہی کی مرہون منت ہیں۔ گذشتہ عشرے کے آخری سالوں سے درس قرآن کی محفلوں میں، جہاں اس کی خطابت کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے، وہ نہایت احتیاط سے سوچے سمجھے مرحلہ وار پروگرام کے تحت نہ صرف اپنا امیج بنانے کی کوشش کرتا رہا ہے بلکہ اس نے یہ ثابت کرنے کے لئے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ اس کے والد ایک عظیم روحانی بزرگ تھے۔

بعد میں جب اس نے اپنے مقاصد کے لئے اخبارات کو استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا، تو اس نے نہایت احتیاط سے اپنی پسند کے ایک جریدے کا انتخاب کیا ــــ نومبر ۱۹۸۶ء میں اس جریدے نے اس کا بہت طویل انٹرویو شائع کیا۔ پاکستان کی صحافتی تاریخ میں کسی بھی لیڈر کا شاید یہ طویل ترین انٹرویو تھا اور اس کے سوالات

اس طرح مرتب کئے گئے تھے، جن سے اسے خود کو ایک قد آور اور مقدس شخصیت کے طور پر پیش کرنے میں آسانی رہے ("کہا جاتا ہے کہ آپ کے والد نے طواف کعبہ کے بعد مقام ملتزم پر کھڑے ہو کر بارگاہ ایزدی میں نرینہ اولاد کے لئے دعا مانگی تھی")---- اس قدر طویل انٹرویو کی اشاعت پر بھی جو سرورق کی کہانی کے طور پر چھپا تھا، علامہ کی تسلی نہ ہوئی اور اس نے تجویز پیش کی کہ کئی دن جاری رہنے والے اس انٹرویو کا مکمل متن سے شائع کیا جائے---- ایسا کرنے کی صورت میں اس نے کئی ہزار کاپیاں خریدنے کی پیشکش کی، جو وہ اپنے مریدوں میں بانٹنا چاہتا تھا، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا---- یہ ۶۴ صفحات پر پھیلا ہوا انٹرویو تھا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے اس امر کا اہتمام کیا کہ اس کے ادارے کی سالگرہ کے حوالے سے لاہور کے دونوں بڑے اخبارات خصوصی رنگین ایڈیشن شائع کریں اب اخبارات اس سے لاڈلے بچے کا سا سلوک نہیں کر رہے جس کا اس نے انہیں چمکار کا اہتمام کیا تھا ("میرے ۲۵ ہزار کارکن ہیں اور وہ آپ کا اخبار خریدیں گے")۔ لیکن حالیہ انتخابی مہم کی وجہ سے اب پھر اس نے اہمیت اختیار کرلی ہے، وہ اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ نہ صرف اخبارات نے سیاست میں داخلے سے پہلے اس کا سواگت کیا بلکہ بڑے سیاسی گروہوں میں سے کسی نے بھی جو سالوں کی محاذ آرائی سے نڈھال تھے، ۲۵ مئی ۱۹۸۹ء کو اس کی مزاحمت اور مذمت کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی، جب اس نے اپنی جماعت بنانے کا اعلان کیا۔ انتہا

تو یہ ہے کہ شعلہ بیان عبدالستار خان نیازی ' ہر وقت لڑنے پر تلے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی اور دنیا بھر سے الجھنے والے ڈاکٹر اسرار احمد نے بھی اس سے صرف نظر کی کوشش کی۔ قاضی حسین احمد نے تو اس سے ملنے اس کے دفتر تک جا پہنچے۔ شاید ان کی خواہش یہ تھی کہ جماعت اسلامی کو ' جسے اپنی پوری تاریخ میں مذہبی گروہوں کی شدید مخالفت سے واسطہ رہا ہے ' ایک اور محاذ پر اپنی توانائی ضائع نہ کرنی پڑے۔ یہ صرف لاہور کا جریدہ "ندا" تھا ' جس نے کسی قدر محتاط لیکن واضح تحریر کے ذریعے ' جو موصوف کے اساتذہ ' سابق ساتھیوں اور اس کے والد کے بعض جاننے والوں سے ملاقات کے بعد لکھی گئی تھی ' یہ بتانے کی کوشش کی کہ علامہ طاہر القادری کی حقیقی شخصیت اور اس کے عزائم کیا ہیں۔

اخبارات اور سیاسی گروہ جماعتوں کی طرف سے غیر معمولی احتیاط کی روش نے پہلے سے پر اعتماد علامہ کے اعتماد میں کچھ اور بھی اضافہ کر دیا اور اس نے ۲۵ مئی ۱۹۸۹ء کو موچی دروازے میں اپنی جماعت کے تاسیسی جلسہ عام سے تین دن پہلے اخبار نویسوں سے ایک ملاقات میں اعلان کیا کہ وہ قادیانیوں سمیت ہر طبقے کے مفادات کے لئے لڑے گا ' جب اس موضوع پر ایک بڑبولے اخبار نویس نے تیز و تند سوالات کی بوچھاڑ کی اور پھر اس فضا میں ایل ڈی اے کی طرف سے ادارہ منہاج القرآن کے لئے وسیع زمینوں کی الاٹمنٹ کا سوال اٹھا ' تو علامہ بجھ سے گئے اور ان کی مخصوص خطابیہ گھن گرج غائب ہو گئی ---- یہ ظاہر تھا کہ وہ خود

بھی الجھنے سے گریزاں ہے اور ظاہری اعتماد کے باوجود اس کے اندر کہیں گہرا خوف چھپا ہوا ہے ------

یہ ۲۲ر مئی کا تذکرہ ہے تین روز بعد کو اس نے موچی دروازہ میں اس جلسہ عام کا اہتمام کیا، جس کے لئے وہ طویل عرصے سے منصوبہ بندی کر رہا تھا---- بلوچستان اور سندھ کے دور دراز ریگستانی علاقوں سمیت ملک بھر سے اس کی خطابت کا شکار ہونے والے ۳۰ ہزار سے زیادہ لوگ لاہور کی تاریخی جلسہ گاہ میں جمع ہوئے، جب کہ جلسہ گاہ کے باہر اس موقع کی مناسبت سے شائع ہونے والے بعض جرائد اور اخبارات کے خصوصی نمبر فروخت ہو رہے تھے ----ہاکی کے سابق کپتان اختر رسول سمیت جو وزیر اعلیٰ پنجاب کے مشیر تھے، صوبائی اسمبلی کے دو ارکان سٹیج پر موجود تھے۔ طے شدہ وقت سے خاصی دیر بعد، اس کی پجارو جیپ سٹیج کے عقب تک پہنچی، جہاں اس نے بال سنوارے اور اپنے کلاشنکوف بردار محافظوں میں گھرا ہوا، سٹیج پر نمودار ہوا۔ اس نے نہایت قیمتی سفید لباس پہن رکھا تھا اور اس کے دائیں ہاتھ میں سبز رنگ کی ایک تسبیح لٹک رہی تھی، روشنیوں کے سیلاب اور نعروں کے شور میں وہ ایک دیو مالائی شخصیت نظر آ رہا تھا۔

اس نے خطاب کا آغاز کیا اور مجمع کے جوش میں اضافہ ہوتا گیا جس کی اکثریت اس کے حامیوں پر مشتمل تھی۔ بلاشبہ یہ ایک اثر انگیز خطاب تھا، جس میں سامعین

کی اکثریت بھی چلی جارہی تھی، لیکن پھر تقریر کے ایک ڈرامائی موڑ پر اس نے اچانک کہا کہ پارٹی کے نام اور منشور کا اعلان وہ اپنے خطاب کے دوسرے حصے میں کرے گا۔

اس وقفے میں سٹیج پر بیٹھے پنجاب اسمبلی کے دونوں ارکان اور راوول کے ہیرو فضل محمود نے اس کی جماعت میں شمولیت کا اعلان کیا۔ جس سے مجمع کے جوش میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ پھر سے سٹیج پر نمودار ہوا۔ اس نے ملک کے دونوں سیاسی گروہوں کی مذمت کی اور اعلان کیا کہ اگر اسے اقتدار ملا تو وہ تین سال کے اندر ملک میں انقلاب برپا کر دے گا۔ اس نے سنسنی خیز اور ڈرامائی انداز میں بعض واقعات بیان کئے اور کہا کہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک جماعت بنا کر اسلام کی خدمت کے لئے میدان میں نکلنے کا حکم دیا ہے۔ بڑی احتیاط کے ساتھ اس نے تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ فرقہ بندی سے بالاتر ہے۔ اس نے معاشی مسائل کو اجاگر کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ وہ عام لوگوں کی قسمت بدل ڈالے گا۔ پھر اس نے دائیں ہاتھ سے قرآن مجید فضا میں بلند کیا اور کہا کہ اگر وہ غلط بیانی کر رہا ہو تو اس پر خدا کی لعنت ہو۔ واضح طور پر، بہت واضح طور پر وہ خود کو ہمسایہ ایران کے روحانی پیشوا امام خمینی ایسی شخصیت کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا، جنہوں نے ایران سے استعمار اور بادشاہت کو اکھاڑ پھینکا تھا اور جن کی قوت ایران کے غربت کی آگ میں جلتے ہوئے محروم اور بے بس لوگ

تھے --- البتہ لوگوں کو اس پر بہت تعجب ہوا کہ اس نے جلسے کی حاضری بیان کرنے میں بے حد مبالغے سے کام لیا۔ اس کے سامنے جلسہ گاہ میں جو ۲۵ ہزار سروں سے لبریز ہو جاتی ہے، اور جس کا پچھلا حصہ خالی تھا، زیادہ سے زیادہ ۲۰ ہزار آدمی تھے، ان لوگوں کی تعداد ۵ سے لے کر ۱۰ ہزار تک، ہو سکتی تھی، جو گردو نواح کی سڑکوں پر گھوم پھر رہے تھے۔ لیکن اس نے کہا کہ یہ لاکھوں کا مجمع ہے " انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر " اس نے کئی بار دہرایا اور دعویٰ کیا کہ اس کے سامعین شاہ عالمی سے ریلوے اسٹیشن تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس شخص کو جو قران مجید اور خدا کو اپنا گواہ بنا رہا تھا، جس کا دعویٰ تھا کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حکم پر اپنی زندگی اسلام کے لئے وقف کر دی ہے، اس قدر، اس قدر مبالغے کی ضرورت کیوں پیش آ رہی تھی ؟۔

کچھ اور سوالات بھی تھے، وہ اسلام کا خدمت گزار ہے لیکن اس کی پارٹی کے نام میں اسلام کے لئے کوئی جگہ نہیں --- پاکستان عوامی تحریک۔ اسے اتنے محافظوں کی ضرورت کیوں ہے ؟ وہ اس قدر مہنگی گاڑی میں کیوں سفر کرتا ہے ؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر وہ واقعی اسلام کا ایک سچا اور بے ریا خادم ہے تو وہ پنجاب کے حکمران صنعت کار خاندان سے مالی مفادات کیوں حاصل کرتا رہا ہے ۔ اخبار نویسوں اور یا پھر دوسرے لوگوں کے لئے اس کا ششدر کرنے والا جواب یہ تھا کہ اس نے شریف خاندان سے بھی کوئی مالی فائدہ حاصل نہیں کیا --- "

آپ نے کوئی مالی فائدہ نہیں اٹھایا ؟" وہ بار بار حیرت سے سوال کرتے تھے' آپ کو وزیر اعلیٰ کے حکم پر پہلے فیصل ٹاؤن میں ۱۶ کینال اور پھر ٹاؤ شپ میں ۱۶۰ کینال زمین کوڑیوں کے مول دی گئی' بازار کے نرخ سے دس فیصد سے بھی کم پر اور آپ کہتے ہیں کہ آپ نے کبھی رعایت حاصل نہیں کی؟" --- "نہیں" اس نے کہا" میں نے کوئی رعایت حاصل نہیں کی" پہلی بار شکوک و شبہات نے سر اٹھانا شروع کیا۔ ایک اخبار نویس نے کہا قرون اولیٰ کے اسلام پر نثار اور رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر فدا ہونے والوں کی کہانیاں سنا کر وہ دوسروں کو رلاتا ہے' لیکن خود نہیں روتا' وہ خود پر رقت طاری کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ایسا کرنے میں اسے کامیابی نہیں ہوتی --- کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ محض ایک اعلیٰ درجے کا اداکار ہو' شہرت کا ایک اور بھوکا' قیادت کا آرزومند ایک اور بیمار آدمی' لیکن زیادہ تر لوگ کھلم کھلا تبصرہ کرنے سے ڈرتے تھے' وہ خدا تعالیٰ' قرآن پاک اور رسول اللہ کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو گواہ بناتا تھا۔۔ اور لوگ ڈرتے تھے!

لیکن انسانوں کا تجسس دروازے کھولتا ہے اور حقائق منکشف ہوتے ہیں' لہٰذا آہستہ آہستہ بتدریج' رفتہ رفتہ اخبار نویسوں' سیاسی کارکنوں' اور مذہبی پارٹیوں کے حامیوں کا تجسس بروئے کار آنے لگا --- وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ یہ آدمی درحقیقت کیا ہے اور کہاں سے آیا ہے' اس کا بچپن کہاں گزرا ہے ؟ اس نے کب اور کہاں خواب دیکھنا سیکھے' دین سے اس

کے بلند بانگ شغف کی حقیقت کیا ہے ؟ شریف خاندان سے اس کے تعلق کی نوعیت کیا رہی ہے' اس نے اب تک کی زندگی کیسے گزاری ہے اس کی عادات و مشاغل کیا ہیں ؟ وہ کس طرح کے شب و روز بسر کرتا ہے' ہزاروں لوگ اس پر فدا کیوں ہیں ؟۔ اس پر وسائل کی بارش کہاں سے ہو رہی ہے اور وہ کس دن کا سپنا دیکھ رہا ہے۔ ؟

-------○--○-------

محمد طاہر کا تعلق' جو اب خود کو قائد انقلاب پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کہلوانا پسند کرتا ہے' جھنگ کے ایک غریب خاندان سے ہے۔ اس کے والد فرید الدین گڑھ مہاراجہ میں ضلع کونسل کے مختصر سے شفاخانہ میں ڈسپنسر کے طور پر کام کرتے تھے۔ انہوں نے طب کی کچھ باقاعدہ اور کچھ بے قاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ ایک مذہبی آدمی تھے' بریلوی مکتب کے ایک راسخ العقیدہ مسلمان ---- وہ قوالیاں سنتے' مزاروں پر جاتے اور اپنی بچت زیارتوں کے لئے بچا کر رکھتے تھے ---- وہ حج کے علاوہ ایک سے زیادہ بار عہد اول کے جلیل القدر مسلمانوں کے مزاروں پر فاتحہ پڑھنے اور برکت حاصل کرنے کے لئے ایران اور عراق گئے ---- مولانا روم کے مزار پر حاضری دینے کے لئے انہوں نے ایک بار خاص طور پر ترکی کا سفر طے کیا ---- ان کے پاس اتنے وسائل کہاں سے آتے تھے ؟ فرید الدین قادری کو

قریب سے جاننے والوں کا کہنا ہے کہ یہ بھلا مانس آدمی کفایت شعار واقع ہوا تھا اور گردو پیش کے زمینداروں کے لئے قوت بخش دوائیں تیار کرتا تھا اور وہ اس کے ساتھ مہربانی سے پیش آتے تھے۔

فرید الدین قادری کے ہاں دو بیٹیوں کے بعد ایک بیٹے نے جنم لیا تو یہ اس کے لئے ایک روز مسرت تھا۔ اگرچہ اس کے وسائل زیادہ نہ تھے، لیکن اس نے اپنے بچے کو لاڈ پیار سے پالا۔ اس کی تعلیم کا آغاز گوجرہ روڈ جھنگ پر اٹلی کے عیسائیوں کے مشنری سکول سے ہوا۔ وعظ کی مجالس، قوالیوں اور مزاروں پر وہ اسے ساتھ ساتھ لئے پھرتے، جہاں لوگ بزرگوں، صوفیوں اور درویشوں کے بارے میں طرح طرح کے حیرت انگیز قصے بیان کرتے تھے۔ غالباً انہی مجالس میں طاہر کے دل میں اس خواب نے جنم لیا کہ وہ ان لوگوں کی طرح کرامات دکھانے اور دوسروں کو حیران کر دینے والا شخص بن جائے --- جہاں تک اس کے والد کا تعلق تھا، اپنی معمولی تعلیم اور شدید مذہبی احساس کے ساتھ وہ اسے ایک شریف آدمی بنانا چاہتے تھے --- ڈسپنسر کی آرزو تھی کہ اس کا بیٹا ڈاکٹر بنے اور نوکری کی بجائے ایک آزاد آدمی کی آسودہ زندگی گزارے۔ اگر محمد طاہر ڈاکٹر نہ بن سکا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ایم بی بی ایس میں داخلے کے لئے ایف ایس سی کے امتحان میں وہ مطلوبہ نمبر حاصل نہ کر سکا۔ والد کی خواہش پر اس نے دوسری بار بھی امتحان دیا اور اب کی بار اس کے نمبر پہلے سے بہتر تھے، لیکن پھر بھی وہ میرٹ تک نہ پہنچ پایا۔ وہ محنتی اور ذہین تھا، لیکن

کرتے ہیں ۔۔۔ ایسے ہی ایک افسوسناک واقعہ کے بعد اس نے ملازمت سے استعفیٰ دی دیا۔ اسے اندیشہ تھا کہ اب اسے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا۔

اس نے قلعہ گوجر سنگھ میں ایک مکان کرائے پر لیا اور ایک دوست سے مالی امداد کی درخواست کی۔ اس سادہ دل آدمی نے اپنے دوست کی مدد کی۔ وہ اس کے مکان کا کرایہ ادا کرتا اور اس کے لئے درس قرآن کی محفلوں کا اہتمام کرتا۔ اس شخص کے توسط سے محمد طاہر کی ملاقات پنجاب کے وزیر خزانہ نواز شریف کے والد اور صنعت کار میاں محمد شریف سے ہوئی ۔۔ اب اس کی مالی حالت سدھرنے لگی اور جلد ہی وہ حلقہ گوجر سنگھ سے سمن آباد کے ایک مکان میں منتقل ہو گیا۔

محمد طاہر نے جو ایک عرصے سے طاہر القادری بن چکا تھا' ۱۹۸۱ء سے شادمان کالونی کی رحمانیہ مسجد میں درس قرآن کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ یہاں یونیورسٹی لاء کالج کے بعض طلبہ اور اساتذہ' اعظم کلاتھ مارکیٹ' برانڈرتھ روڈ اور اکبری منڈی کے خوش حال اور خوش عقیدہ تاجروں کے علاوہ اس آسودہ حال آبادی کے بعض لوگ بھی درس میں شریک ہوتے ۔۔۔ ان میں سے بعض اس جوان سال مفسر سے بری طرح متاثر تھے۔ "میں نے اپنی زندگی کے دو سال اس طرح گزارے کہ میں اسکے ہر حکم کی تعمیل پر آمادہ رہتا تھا" ۔۔۔ ان لوگوں میں ایک نے بتایا' جو اب اس کا نام سن کر بھڑک اٹھتا ہے اور اسے ایک جعل ساز قرار دیتا ہے۔

اسی شخص کے توسط سے' جو اپنا چھوٹا سا کاروبار کرتا ہے اس کی میاں شریف سے

پہلی ملاقات ہوئی ۔ میاں شریف کو اپنی نو تعمیر اتفاق مسجد کے لئے ایک خطیب کی تلاش تھی ۔ انہوں نے طاہر القادری سے اس سلسلے میں رابطہ کیا تو اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا لیکن اس نے بزرگ صنعت کار کے سامنے چند شرائط پیش کیں ۔ اس نے کہا کہ وہ کوئی معاوضہ قبول نہیں کرے گا لیکن انہیں اس کے خطبات جمعہ کو پمفلٹ کی صورت میں طبع کرانا ہوگا اور اس کے کیسٹ بنائے جائیں گے ۔ نوجوان آدمی کو اپنی خطابت کے جادو کا اندازہ ہو چکا تھا --- میاں شریف نے ان شرائط کو تسلیم کر لیا ۔ مسجد کی تعمیر پر لاکھوں روپے صرف کرنے والے آدمی کے لئے چند ہزار روپے ماہوار کے خرچ کی اہمیت کیا تھی ؟

انہی دنوں اسلام آباد میں طاہر القادری کی ملاقات اپنے ایک سابق استاد اور اپنے والد کے ایک دوست سے ہوئی ۔ انہوں نے بے تکلفی کے ساتھ اس سے سوال کیا کہ اس نے یونیورسٹی کی نوکری کیوں چھوڑ دی ؟ برا سا منہ بنا کر اس نے جواب دیا کہ اس تنخواہ میں اس کی گزر بسر ڈھنگ سے نہیں ہوتی تھی ۔ تمکنت اور طنطنے کے ساتھ اس نے کہا کہ اسے یونیورسٹی سے جو تنخواہ ملتی تھی ، اس سے کہیں زیادہ روپے اس کے باورچی خانے میں خرچ ہو جاتے ہیں ۔ بزرگ استاد نے حیرت سے کہا کہ ابھی چند سال پہلے وہ ان سے مالی مدد کی درخواست کر رہا تھا اور اس نے التجا کی تھی کہ اسے کہیں سے وظیفہ دلوا دیا جائے --- اب اچانک اس کے مالی حالات اتنے اچھے کیسے ہو گئے --- اسی سوال پر وہ گھبرا گیا اور اس نے

بتایا کہ اپنا جھنگ کا مکان بیچ کر اس نے کاروبار شروع کر رکھا ہے۔۔۔۔ واقعی اس نے مکان بیچ ڈالا تھا، لیکن اس کی آسودگی کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ میاں شریف نے اس کے لئے سیمنٹ کی ایک ایجنسی حاصل کی تھی اور وہ اس کے علاوہ مختلف طریقوں سے اس کی مالی امداد کرتے تھے، بتدریج یہ مالی امداد سوا لاکھ روپے ماہوار تک جا پہنچی، جس کا بڑا حصہ اتفاق مسجد میں قائم ہونے والے مدرسے کے لئے تھا، جسے ایک پر شکوہ نام دیا گیا تھا، لیکن اس کا کچھ حصہ محمد طاہر القادری کی ذات پر صرف ہوتا تھا۔

۱۹۸۲ء میں شہرت کے مطلع پر طاہر القادری کا ستارہ اس وقت چمک اٹھا، جب الھدیٰ کے عنوان سے ٹی وی سے نشر ہونے والا ڈاکٹر اسرار احمد کا درس قرآن بند کر دیا گیا۔۔۔ سیکرٹری اطلاعات شیخ مجیب الرحمٰن ڈاکٹر اسرار احمد کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ٹی وی کو اب ایک نئے مفسر کی طرح تلاش تھی۔ طاہر القادری سے بہتر متبادل کون ہو سکتا تھا، جو ایک صوبائی وزیر کے والد کی مسجد میں نماز پڑھاتا تھا اور جس کی خطابت کا چرچا دور تک سنائی دے رہا تھا۔ اپنے درد اور علم کی وجہ سے ڈاکٹر اسرار احمد ایک بہت مقبول مفسر تھے اور ان کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ بھارتی پنجاب کے بعض غیر مسلم تک ان کا پروگرام باقاعدگی سے سنتے تھے، لہٰذا شروع میں طاہر القادری کو اپنا رنگ جمانے میں بڑی دقت پیش آئی، لیکن رفتہ رفتہ وہ چل نکلے اور اور جیسا کہ محاورے میں کہا جاتا ہے، آنکھ او جھل پہاڑ او جھل، رفتہ رفتہ

لوگ ڈاکٹر اسرار احمد کو بھول گئے اور چیختے چلاتے طاہر القادری بتدریج منظر پر چھا گئے۔ وہ آخر قرآن ہی تو سنا رہے تھے۔

ڈاکٹر اسرار کے زمانے میں بھی ٹی وی پر ستائشی خطوط موصول ہوئے تھے لیکن طاہر القادری کے درس کا سلسلہ شروع ہوا تو خطوط کی تعداد برابر بڑھتی چلی گئی اور ایک بار تو یہ بھی ہوا کہ کسی وجہ سے پروگرام نشر نہ ہو سکا مگر تعریفی خطوط اتنی ہی تعداد میں موصول ہو گئے۔

۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات کے بعد نواز شریف وزیر اعلیٰ بنے تو طاہر القادری کی قوت و شوکت میں اضافہ ہو گیا۔ سعادت مند بیٹے نے اپنے والد کی خواہش پوری کرنے کے لئے انہیں فیصل ٹاؤن میں ۱۶ کینال کا ایک پلاٹ دلوایا۔ نواز شریف جمعہ پڑھنے اتفاق مسجد میں جاتے تو واپسی پر طاہر القادری ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جاتے اور مختلف لوگوں کے کام کی سفارش کرتے۔ انہی دنوں اس نے اپنے بعض حامیوں کو پولیس میں بھرتی کرایا۔ شروع شروع میں میاں نواز شریف ان کی ہر سفارش مان لیتے تھے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سفارشوں کا سلسلہ دراز تر ہوتا گیا اور ان کے لئے سب فرمائشوں کو پورا کرنا ممکن نہ رہا۔ نواز شریف مزاجاً سخی اور کم گو واقع ہوئے ہیں۔ عام طور پر وہ فرمائشیں پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جب ان کا کوئی جاننے والا یا دوست کسی ایسے کام پر اصرار کرے جو کسی وجہ سے کیا نہ جا سکتا ہو تو خاموشی اختیار کر لیتے ہیں یا اشارے سے

سے ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں - وہ طاہر القادری کو ایک نیک اور ذہین آدمی سمجھتے تھے، لیکن انہیں اس وقت بہت تعجب ہو جب طاہر القادری مجبوری سے روکے گئے بعض کاموں پر اصرار کرتے چلے گئے - لاہور کے ہزاروں خوش عقدہ لوگوں کے درمیان جنہیں وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب رسولؐ کی کہانیاں سنا کر رلاتے تھے، اب وہ ایک پیر کی حیثیت اختیار کر چکے تھے اور انہیں اس امر پر توہین کا احساس ہوا کہ ان کے سرپرست لیکن مرید کا صاحبزادہ ان کے احکامات کی تعمیل سے گریز کر رہا ہے --- اسی صورت حال میں انہیں شریف خاندان سے الگ ہو جانا چاہئے تھا، لیکن وہ فوری طور پر ایسا نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ انہیں اس خاندان سے ہر ماہ سوا لاکھ روپے کی امداد ملتی تھی - پھر یہ کہ وہ مستقبل کی منصوبہ بندی کر رہے تھے اور فیصلے کا وقت ابھی نہیں آیا تھا -

انہی دنوں میاں شریف نے انہیں ایک کار تحفے میں دی --- اس سے پہلے وہ فیصل ٹاؤن میں ۱۶ کینال کے پلاٹ کے لئے انہیں شام کو بنک کھلوا کر ۵ لاکھ روپے دے چکے تھے - کچھ عرصہ بعد جب ٹاؤن شپ سکیم میں الاٹمنٹوں کا وقت آیا تو انہوں نے اپنے بیٹے سے کہہ کر اسے ۸ ہزار روپے کینال کے حساب سے ۱۶۰ کینال زمین دلوائی - اس پر کچھ شور تو اٹھا لیکن زیادہ واویلا اس لئے نہ مچا کہ یہ زمین ایک مدرسے کے نام پر حاصل کی گئی تھی --- شریف خاندان سمیت کسی کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ طاہر القادری کے آئندہ ارادے کیا ہیں ---

اب تک اپنے سادہ لوح مریدوں اور شریف خاندان کی سرپرستی کے طفیل طاہر القادری وہ سب کچھ حاصل کر چکے تھے، جس کی انہیں آرزو تھی۔ لہٰذا اب انہوں نے اگلے مرحلے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔

اب وہ فیصل ٹاؤن میں ۲۵ لاکھ روپے کے ایک مکان، کئی کاروں اور ۷۶ اکینال قیمتی اراضی کے مالک تھے --- وہ تحریک میں شامل ہونے والے سادہ اور نیک دل کارکنوں اور خوشحال تاجروں سے عطیات وصول کرنے کے علاوہ جو جمعیت علماء پاکستان کی سیاسی ناکامی کے بعد ان کی طرف آ گئے تھے، ادھر ادھر سے بھی مال بٹور رہے تھے۔

اب وہ میں شریف خاندان سے الگ ہو کر زندہ رہ سکتے تھے۔ اب ان سے کہیں زیادہ طاقتور لوگ (روایت کے مطابق بعض غیر ممالک) ان کی سرپرستی پر آمادہ تھے --- اب وہ دن گزر چکے تھے جب میاں شریف خاندان نے دل کی بیماری میں مبتلا آدمی کو امریکہ میں اور اس کی بیمار اہلیہ کو علاج کے لئے بھارت بھجوایا تھا --- اب وہ دن بھی گزر چکے تھے جب میاں نواز شریف انہیں اپنے کندھوں پر اٹھا کر غار حرا تک لے گئے تھے اور واپسی پر طاہر القادری نے اعلان کیا تھا کہ غار حرا میں اس کی ملاقات ایک کشمیری فرشتے سے ہوئی --- اب فرشتے کشمیری نہیں رہے تھے، اب وہ فارسی اور عربی بولتے تھے اور ان کا تعلق پاکستان سے نہیں تھا۔
۱۹۸۹ء کے آغاز میں طاہر القادری نے اپنے بعض ساتھیوں کو اعتماد میں لے کر یہ

بتانا شروع کیا کہ اس کے راستے شریف خاندان سے الگ ہو سکتے ہیں۔ اب وہ آسودہ اور طاقتور تھا اسے کسی کا احسان یاد رکھنے اور کسی کے ساتھ چلنے کی ضرورت نہ تھی۔

۱۹۸۹ء کے موسم بہار میں اس نے اتفاق مسجد کو خیرباد کہنے اور شریف خاندان سے الگ ہونے کا اعلان کر دیا۔ ایک بھرپور پروپیگنڈہ مہم کے بعد جو کئی ماہ جاری رہی اس نے موچی دروازے میں ایک جلسہ عام منعقد کر کے پاکستان عوامی تحریک کے قیام کا اعلان کیا۔ اس نے متعدد اہم سیاسی شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں اور انہیں اپنی جماعت میں شمولیت کی دعوت دی۔ ان میں اس کے زمانہ طالب علمی کا لیڈر جاوید ہاشمی اور موجودہ وزیر اطلاعات سیدہ عابدہ حسین شامل تھیں۔ جاوید ہاشمی نے جنہیں وہ اپنا مدرسہ، دفتر اور سبز باغ دکھانے کے لئے منہاج القرآن لے گیا، اسے خوش اسلوبی سے ٹال دیا اور اسی طرح سیدہ عابدہ حسین نے بھی، جنہیں اس نے خواتین کے شعبے کا سربراہ بننے کی پیشکش کی تھی۔ غالباً وہ انہیں اپنی جماعت میں شامل کر کے ملک کی شیعہ آبادی کی حمایت حاصل کرنا چاہتا تھا اور یہ تاثر دور کرنے کا خواہش مند تھا کہ وہ محض ایک مذہبی لیڈر ہے۔ اسے داد دینی چاہئے کہ اس نے ایک ایسی خاتون کو چنا، جس کا سیاسی کردار بے داغ تھا، لیکن اس کا تیر نشانے پر نہیں لگا ـــــ بعد میں سیدہ عابدہ حسین اس پر حیرت کا اظہار کرتی رہیں کہ آخر اس آدمی کو سوجھی کیا، لیکن وہ جھنگ میں اس کے بڑھتے ہوئے اثر

و رسوخ سے پریشان بھی تھیں اور ایک بار انہوں نے کہا کہ یہ شخص انہیں ہرانے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے، اگرچہ بیشتر لیڈروں سے طاہر القادری کے مذاکرات ناکام رہے لیکن وہ شیخوپورہ کے ایک آزاد امیدوار سمیت، پنجاب اسمبلی کے دو ارکان کو اپنی پارٹی میں شامل کرنے پر کامیاب ہو گیا۔ اخبار نویسوں اور سیاسی کارکنوں کا تاثر یہ تھا کہ وہ جمعیت علماء پاکستان جیسی قوت ضرور حاصل کر لے گا اور اس طرح پنجاب کی بعض نشستوں پر طاقت کا توازن اس کے ہاتھ میں آ جائے گا ۲۵ ر مئی ۱۹۸۹ء کو موچی دروازہ کے جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے اس نے پیپلز پارٹی پر زیادہ سختی سے نکتہ چینی کی، لیکن اسلامی جمہوری اتحاد کے بارے میں بھی اس کا رویہ زیادہ مختلف نہ تھا۔ اس نے میاں نواز شریف یا ان کے والد کا نام تو نہ لیا مگر ان کی طرف واضح اشارہ کرتے ہوئے بنکوں سے قرضے حاصل کرنے والوں کو مطعون کیا۔ اسے اس بات کی کوئی پرواہ نہ تھی کہ کوئی اسے احسان فراموش ہونے کا طعنہ دے گا۔

شریف خاندان نے اس معاملے کو کس طرح لیا ؟ عام اندازوں کے برعکس انہوں نے صبر اور تحمل کا مظاہرہ کیا۔ ایک ایسے شخص کی گالی برداشت کرنا کتنا مشکل ہے، جو کل تک آپ کے دسترخوان پر بیٹھتا اور آپ کے قصیدے کہتا رہا ہو، لیکن میاں نواز شریف اور ان کے بیٹوں نے ایسا کر دکھایا۔۔۔۔۔ اگرچہ وہ اس شخص کو نہیں سمجھ پائے تھے، لیکن وہ منجھے ہوئے اور جہاں دیدہ لوگ تھے۔

طاہر القادری کا خیال تو یہ تھا وہ بھڑک اٹھیں گے ------ وہ انہیں تکلیف پہنچا کر لطف اٹھانے کا خواہش مند تھا' مگر انھوں نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ اسے اپنی زندگی میں شاید ہی کسی چیز سے اس قدر تکلیف پہنچی ہو گی' جتنی ان کے اس رویئے سے ----- شریف خاندان کے اس طرز عمل نے اسے رلا دیا۔

نواز شریف مسلسل کامیابیاں حاصل کر رہے تھے اور پیپلز پارٹی کی جرأت سے مزاحمت کرنے کی وجہ سے 'نہ صرف پنجاب بلکہ حید آباد' کراچی اور صوبہ سرحد میں بھی' وہ ایک ہیرو بن کر ابھر رہے تھے۔ دوسری طرف صورتحال یہ تھی کہ پہلے جلسۂ عام کے بعد' وہ کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ اس کے دونوں صوبائی ارکان اسمبلی اسے چھوڑ گئے اور کوئی اہم شخصیت اس کی میں شامل نہ ہوئی ------ بد قسمتی کی انتہا تو یہ تھی کہ مولوی احمد علی قصوری کو جو انتہائی غیر موثر شخصیت کے مالک ہیں' اسے پارٹی کا دوسرا اہم منصب سونپنا پڑا۔

۱۹۸۹ء میں اس نے مختلف چھوٹی سیاسی جماعتوں سے مذاکرات کے بعد جو پیپلز پارٹی اور اسلامی جمہوری اتحاد کے درمیان خود کو تحلیل ہونے کے خطرے سے دوچار محسوس کر رہی تھیں' اس نے ایک جماعتی اتحاد کی تشکیل کا تجربہ کیا' اس اتحاد میں اصغر خان کی تحریک استقلال اور تحریک فقہ نفاذ جعفریہ شامل تھیں ۔ اس اشتراک عمل کے موقع پر اس نے اپنے مریدوں کو یقین دلایا کہ اس اقدام سے پاکستان کا سیاسی منظر بدل جائے گا لیکن اس کے برعکس ہوا یہ کہ چند ہفتوں

میں اصغر خان کی سیکولر، علامہ ساجد نقوی کی شیعہ اور اس کی بریلوی جماعت کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا ------ اب اخبارات میں اس کے خلاف لکھا جانے لگا۔ اکا دکا بے خوف علماء نے بھی اس کے خلاف آواز اٹھانا شروع کی اور اس نے محسوس کرنے شروع کیا کہ وہ بعض غیر ملکی قوتوں کی نوازشوں کے باوجود، زوال کا شکار ہو رہا ہے۔

یہ تھا وہ پس منظر جس نے اس پر قاتلانہ حملے کا ڈرامہ رچانے کے ضرورت محسوس کی۔ ۲۲ر اپریل کو رات ڈیڑھ بجے روزنامہ نوائے وقت لاہور، کے نیوز روم میں ٹیلی فون پر اس کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی ---- اس کا کہنا تھا کہ اس کے گھر پر گولیوں کا مینہ برس رہا ہے اور یہ کہ اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت اسے قتل کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اسے کس نے بتایا تھا کہ حملہ آوروں کا تعلق اسلامی جمہوری اتحاد سے ہے ؟ اگلے روز جب اخبار نویسوں نے اس سے سوال کیا تو اس کا جواب یہ تھا کہ اسے ان لوگوں کی طرف سے دھمکیاں موصول ہوتی رہی ہیں۔

پیپلز پارٹی کی مرکزی حکومت نے طاہر القادری سے اظہار ہمدردی کیا اور وزیر داخلہ اعتزاز احسن سمیت اس کے کئی نمائندے اس سے ملنے آئے۔ ٹیلی ویژن اس معاملے کو اچھالتا رہا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ اس معاملے میں اس کی پیپلز پارٹی سے پہلے ہی ملی بھگت تھی یا ان دونوں کو ان کے اپنے اپنے مفاد نے یکجا کر دیا

تھا، لیکن عام لوگوں اور اخبار نویسوں کو ان سوالوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہی نہ تھے کہ علامہ طاہر القادری کے گھر پر حملہ ہوا ہے۔ بیشتر لوگوں کو یقین تھا کہ محض ایک ڈرامہ ہے، جو سیاسی موت سے خوفزدہ ایک چالاک آدمی نے سٹیج کیا ہے ۔۔۔۔ میاں نواز شریف کی حکومت نے جو ایک سال بھر سے صبر کا مظاہرہ کر رہے تھے، ایک مختصر سے اعلان سے بساط اس پر الٹ دی۔ ۳۰ ر اپریل کے اس اعلان کے مطابق پنجاب کی حکومت نے ہائی کورٹ کے ایک جج کے ذریعے واقعہ کی تحقیقات کرانے کا فیصلہ کیا تھا۔

۲۵ مئی کو مینار پاکستان پر پاکستان عوامی تحریک کے جلسہ عام میں طاہر القادری خوب گرجے برسے انہوں نے اعلان کیا کہ وہ ستمبر سے ایک تحریک برپا کر کے مرکز میں پیپلز پارٹی اور صوبے میں اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومتوں کو ختم کر دیں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ آئندہ انتخابات میں ان کی جماعت پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کرے گی اور یہ کہ وہ ۳ سے ۶ ماہ کے عرصے میں عوام کی قسمت اور ملک کا ماحول بدل ڈالیں گے۔

ادھر تحقیقات کا سلسلہ جاری تھا۔ علامہ نے شروع شروع میں جسٹس فضل کریم کی عدالت میں جاری تحقیقات میں بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے پاس گولیوں کے خول اور گھر کے صحن میں خون کے دھبے تھے اور اسے یقین تھا کہ وہ اپنا موقف منوالے گا۔

چار ہفتے کی سماعت کے بعد جس میں علامہ اور اس کے گواہوں نے اپنا موقف تفصیل سے پیش کیا غیر متوقع طور پر پیش آنے والے ایک واقعہ نے علامہ کو اور بھی بڑھ چڑھ کر بولنے کا موقعہ فراہم کیا۔ جسٹس فضل کریم مبینہ طور پر ایڈووکیٹ جنرل کی کسی بات سے بدمزہ ہو گئے اور انہوں نے تحقیقات سے الگ ہونے کا اعلان کر دیا۔ ۱۶ جولائی کو علامہ نے اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اگر کو تحقیقات میں معطل نہ آتا تو وہ ۵ جون کو عدالت میں ایسے شواہد پیش کرنے والے تھے جن سے ثابت ہو جاتا کہ انہیں قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور اس کوشش کے پیچھے وزیر اعلیٰ نواز شریف کا ہاتھ تھا۔

مختصر وقفے کے بعد جسٹس اختر حسن کی سربراہی میں دوبارہ سماعت کا آغاز ہوا۔ یہ علامہ اور اس کے ساتھیوں پر بحث کا مرحلہ تھا، فوراً ہی علامہ نے فرار کا راستہ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اول تو اس نے یہ مطالبہ کیا کہ اسے تحقیقات میں تعطل کے اسباب سے آگاہ کیا جائے، اور پھر یہ کہا کہ سرکاری وکیل اس سے متعلقہ سوال کرنے کی بجائے، اس کی کردار کشی کر رہے ہیں۔

اب اس نے یہ بھی کہا کہ اس نے تحقیقات کا سرے سے مطالبہ ہی نہیں کیا تھا اور یہ کہ حکومت نے یہ سارا اہتمام اس کے منہ پر سیاہی ملنے کے لئے کیا ہے۔ علامہ کے بائیکاٹ کرنے کے باوجود عدالت نے تحقیق جاری رکھی۔ گواہوں کے بیانات قلم بند کرنے کے بعد ستمبر میں عدالت نے اپنی رپورٹ جاری کر دی۔ (

دیکھئے ضمیمہ) اس پر وہ چیخا چلایا لیکن ظاہر ہے کہ یہ حکومت کا نہیں عدالت کا فیصلہ تھا۔ اسی ادارے کے ہفت روزہ جریدے نے، جس کے ماہنامے نے ۳ سال پہلے اس کا ۶۴ صفحات کا انٹرویو چھاپ کر اسے حضرت داتا گنج بخشؒ کے مرتبے کا شخص ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، عدالت کی اس رپورٹ کو اس عنوان سے شائع کیا۔

" وہ ایک محسن کش، ناشکر گزار، خود غرض، جھوٹے، دولت کے پجاری، خود پرست اور شہرت کے بھوکے انسان ہیں "۔

عدالت نے فائرنگ کی کہانی کو مسترد کر دیا اور علامہ پر عائد کئے جانے والے الزامات کی تصدیق کر دی۔

------○--○-------

اپریل ۱۹۰۰ء کے آخری ہفتے سے اس نے اسلامی جمہوری اتحاد کے خلاف ایک مہم شروع کر رکھی تھی، بظاہر وہ پیپلز پارٹی پر بھی نکتہ چینی کرتا تھا، لیکن وہ اپنے دلائل اس طرح پیش کرتا تھا، جس کی زد اسلامی جمہوری اتحاد پر پڑے ۔ مذکورہ عدالتی فیصلے نے اسے اور بھی برہم کر دیا، چنانچہ جب ۶ر اگست ۱۹۹۰ء کو صدر نے اسمبلیاں توڑ کر نئے انتخابات کرانے کا اعلان کیا تو اس نے مختلف حلقوں، خاص

طور پر لاہور میں قومی اسمبلی کے نمایاں حلقوں میں اپنے امیدوار نامزد کر دیئے۔

اب وہ بڑی سرگرمی سے ان کی انتخابی مہم چلا رہا ہے، اپنے ہاتھ میں قرآن اٹھا کے، وہ قسمیں کھاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر ان کی بشارتوں کے حوالے دے کر رقت آمیز واقعات سنا کر، وہ اپنی خطابت سے لوگوں کو مسحور کرتا اور ان سے خدا اور رسولؐ کے نام پر ووٹ کی التجا کرتا ہے۔ اس کی حکمت عملی یہ ہے کہ ہر حلقے میں چند ہزار ووٹ ضائع کر کے اسلامی جمہوری اتحاد کی چند نشستیں ضائع کر دے ------ یوں مرکز اور صوبے میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم کرنے کا راستہ ہموار کیا جا سکے ------- صرف اسی صورت میں اس کی زخمی انا تسکین پا سکتی ہے اور اس کے مفادات کا تحفظ ہو سکتا ہے۔

-------○--○-------
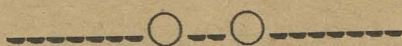
علامہ کے مفادات اب بہت پھیلے ہوئے ہیں، اگرچہ اس نے ایک مدرسہ قائم کر رکھا ہے، جسے وہ پاکستان کی بہترین درس گاہ قرار دیتا ہے، لیکن اس کے اپنے بچے ایچی سن کالج میں تعلیم پاتے ہیں۔ وہ اپنے گھر سے متصل ۵۰ لاکھ روپے کی کوٹھی خریدنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے گھر میں پجارو سمیت پانچ گاڑیاں ہیں۔ ان میں سے ایک سفید رنگ کی سوزوکی اس کے سکول جانے والے بچوں کے

آرام کی وجہ سے' ایسا کرنا نہیں چاہتے تو اچانک ساتھ والے کمرے میں
فون کی گھنٹی بجی ' اس پر کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی ------ لیکن چند ہی
منٹ کے بعد وہ اس طرح گفتگو کر رہا تھا' گویا سرے سے کوئی واقعہ پیش ہی نہیں
آیا۔ اگر سادہ دل اور نیک طنیت فرید الدین زندہ ہوتے اور وہ یہ منظر اپنی آنکھوں
سے دیکھتے تو ان کے دل پر کیا گزرتی ؟

-------○--○-------

ضمیمہ

لاہور ہائیکورٹ کا فیصلہ

"مسٹر قادری ذہنی طور پر ایک بیمار آدمی ہیں"

(ا) یہ یک رکنی ٹریبونل حکومت پنجاب کے نوٹیفکیشن بتاریخ ۳۰ اپریل ۱۹۹۰ء کے مطابق پنجاب ٹریبونلز آف انکوائری آرڈیننس ۱۹۶۹ء کی دفعہ ۳ کے تحت قائم کیا گیا۔ ٹریبونل نے اس امر کی تحقیقات کرنی تھی کہ علامہ ڈاکٹر طاہر القادری جو ایک معروف عالم دین اور پاکستان عوامی تحریک کے چیئرمین ہیں' کی رہائش گاہ بمقام بلاک ایم ماڈل ٹاؤن لاہور' پر ۲۱ اپریل ۱۹۹۰ء کو صبح ایک بج کر پندرہ منٹ پر جو پراسرار فائرنگ کا سانحہ پیش آیا' کے پس پشت کون لوگ تھے' فائرنگ کرنے والے نامعلوم افراد کون تھے۔ تفتیش کی حدود کار یہ تھیں:

(i) یہ معلوم کرنا کہ علامہ ڈاکٹر طاہر القادری کی رہائش گاہ پر ہونے والی پراسرار فائرنگ کا پس منظر اور نوعیت کیا تھی ؟

(ii) یہ معلوم کرنا کہ علامہ ڈاکٹر طاہر القادری کے باڈی گارڈز باڈی گارڈوں کی طرف سے کی گئی فائرنگ کی نوعیت کیا تھی ؟ وہ اس ضمن میں کس حد تک گئے ؟

(iii) یہ معلوم کرنا کہ فائرنگ کرنے والے کون تھے ؟ اور یہ کہ متذکرہ فائرنگ کا محرک کیا تھا ؟

(iv) یہ معلوم کرنا کہ متذکرہ فائرنگ میں علامہ ڈاکٹر طاہر القادری کی املاک کو کتنا اور کس حد تک نقصان پہنچا۔

(v) (الف) متذکرہ فائرنگ میں ملوث مجرموں کی گرفتاری اور صورتحال میں مقامی پولیس اور انتظامیہ کا کردار۔

(ب) یہ معلوم کرنا کہ ہمسایوں میں 'اگر کوئی ہے' متذکرہ سانحہ میں کون کون ملوث ہے۔

(vi) یہ معلوم کرنا کہ سانحہ کی تفتیش میں مقامی پولیس کا رویہ کیا تھا اور یہ کہ پولیس نے کس درجے کی تفتیش سے کام کیا ہے ؟

(vii) یہ معلوم کرنا کہ مقدمے کی سفارشات کے حوالے سے تفتیش کے دوران کس مستعدی سے کام لیا گیا اور یہ کہ پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری کی سیکورٹی کور (SECURITYCOVER) کے لئے سفارشات میں کہاں تک خیال رکھا گیا ؟

(viii) متذکرہ بالا مسئلے سے متعلق دیگر نکات !

(۲) ابتدا میں یہ میرے فاضل بھائی جناب جسٹس فضل کریم کو ٹریبونل کی ذمہ داری سونپی گئی ۔ انہوں نے بارہ گواہوں کے بیانات قلم بند کئے ۔ ایک ٹی ۔ ڈبلیو اور گیارہ پی ڈبلیو) جن میں خود مسٹر قادری شامل تھے، جبکہ آگے چل کر مورخہ ۹ جولائی ۱۹۹۰ء کو فاضل ایڈووکیٹ جنرل اور مسٹر قادری کے درمیان جرح کے دوران میں، طاہر القادری نے تفتیش کا ساتھ دینے سے معذوری کا اظہار کر دیا ۔۔۔۔ اسی اثناء میں، ان کے اعلامیہ بتاریخ ۱۴ر جولائی ۱۹۹۰ء کے بعد حکومت پنجاب نے جزوی طور پر ۳۰ر اپریل ۱۹۹۰ء کے اصل نوٹیفکیشن میں ترمیم کرتے ہوئے مجھے جناب فضل کریم جج کی جگہ تعینات کیا کہ میں "فائرنگ کے سانحہ سے متعلق عدالتی تحقیق کو جاری رکھتے ہوئے پایہ تکمیل تک پہنچاؤں" ۔

(۳) اس اہم نکتے کا اعادہ ضروری خیال کیا جاتا ہے کہ مسٹر قادری نے ۱۷ر جولائی ۱۹۹۰ء کو ایک درخواست دائر کی جس میں ٹریبونل کے دوبارہ اجراء پر اعتراضات کئے گئے، انہوں نے یہ شکایت بھی کی کہ میرے پیشرو فاضل جج متعلقہ معاملے میں ذہن بنا چکے تھے لیکن انہوں نے انسپکشن نوٹ میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا، اور، انہوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ مقدمے کی از سر نو کارروائی شروع کی جائے ۔۔۔۔۔ وہ (ڈاکٹر طاہر القادری) ان اعتراضات پر اس قدر بضد اور مصر تھے کہ انہوں نے کھلے عام اس بات کا اظہار کر دیا کہ اگر ان کا مطالبہ نہ مانا گیا تو وہ عدالتی کارروائی کا بائیکاٹ کر دیں گے اتفاق سے میرے تفصیلی حکم بتاریخ ۶ جولائی ۱۹۹۰ء میں ان اعتراضات اور مطالبات کو رد کر دیا گیا تھا جس کی بنا پر مسٹر قادری نے کارروائی کا بائیکاٹ کر دیا ۔ مسٹر قادری کے بائیکاٹ کے بالمقابل صوبائی حکومت نے اپنا موقف تبدیل نہ کیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ مزید شہادتیں پیش کی جائیں ۔ فی الحقیقت انہوں نے یہ درخواست کی تھی کہ مسٹر قادری کو (عدالت میں) بلا کر جرح کی جائے ۔۔۔۔ لیکن حکومت پنجاب کی یہ درخواست ۲۳ر جولائی ۱۹۹۰ء کے حکم نامے میں مسترد کی جا چکی تھی ۔۔۔۔ یہ خیال کیا گیا کہ چونکہ وہ (طاہر القادری) خود ساختہ رویئے کے تحت کارروائی سے قطع تعلق کر چکے ہیں، اس

لئے غالباً وہ عدالت کے سوالات کے جوابات دینے کے لئے رضامند نہیں ہوں گے اور ٹریبونل کے پاس چونکہ توہین عدالت کے ضمن میں انہیں سزا دینے کا اختیار نہیں ہے اور ٹریبونل کے لئے زیادہ مناسب نہ سمجھا گیا کہ ان کے خلاف پنجاب ٹریبونلز آف انکوائری آرڈیننس ۱۹۶۹ء ---------------------- کی دفعہ (۴) ۵ کے تحت شکایت درج کرے، رام کمار بنام شہنشاہ (اے آئی آر ۷ ۱۹۳ء اودھ ۱۶۸) کے مقدمے کی مثال پر بھروسہ کرتے ہوئے فاضل ایڈووکیٹ جنرل نے مطالبہ کیا کہ چونکہ وہ مسٹر قادری سے رو در رو سوالات مکمل نہیں کر سکے، اس لئے موخر الذکر کے تمام بیانات زیر غور مسئلے سے خارج کر دینے چاہیں ۔ یہ ایک سخت درخواست تھی لیکن اسے مسٹر قادری کی ہٹ دھرمی کے موجب قبول کرنا پڑا نتیجتاً ان کے مکمل بیان کو خارج کرنا پڑا، حقیقت یہ ہے کہ مسٹر قادری نے کارروائی میں حصہ لینے سے گریز کیا، جبکہ حکومت نے سولہ گواہوں کو پیش کیا۔ (جی ڈبلیوز ایک تا ۱۶) اس کے علاوہ سی ڈبلیوز بالترتیب ایک تا دو بحیثیت عدالتی و عمارتی ماہرین کو بھی جرح کے عمل سے گزارا گیا۔ اس سے قبل پیشرو فاضل جج کی طرف سے انہیں یہ ہدایت کی گئی کہ وہ متعلقہ مسئلے کے حوالے سے بلڈنگ کے حدود اربع تعمیر کی صحیح صحیح نشاندہی کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کریں اور یہ کہ مختلف مقامات پر لگنے والی گولیوں کے بارے میں بھی بالتفصیل اظہار خیال کریں، شہادتوں کے آخر میں فاضل ایڈووکیٹ جنرل نے اپنے مقدمے کا مکمل جائزہ پیش کیا۔

(۴) تحقیقات کا اہم سوال مسٹر قادری کے گھر نام نہاد بے تحاشہ فائرنگ کے بارے میں تھا۔ یہ سوال ریفرنس کے ابتدائی تین نکات میں بھی بہ تکرار موجود ہے۔ معلوم یہ کرنا تھا کہ فائرنگ کا پس منظر کیا تھا ؟ نوعیت کیا تھی، فائرنگ کس حد تک کی گئی ؟ محرک اور نوعیت کیا تھی، اور یہ کہ رد عمل میں مسٹر قادری کے ذاتی محافظوں کی فائرنگ کا انداز کیا تھا ! گھڑے گھڑائے بیانات داغے گئے کہ دشمن گروہ نے فائرنگ کا ارتکاب کیا ہے۔ سید اکرم شاہ نے ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ پاکستان کو اسلام اور جوہری طاقت کے حصول سے محروم کرنے کے لئے ایک

بین الاقوامی سازش تیار کی گئی اور چونکہ مسٹر قادری نے اسلام میں ایک قابل ذکر اور بین الاقوامی حیثیت حاصل کرلی ہے' اس لئے انہیں اس کا نشانہ بنایا گیا۔ قدرت اللہ (پی ڈبلیو) نے جو مسٹر قادری کی اہلیہ کے بھائی اور مسٹر قادری کے ذاتی محافظ ہیں' انکشاف کرتے ہوئے کہا کہ مسٹر قادری کی مسلم لیگ' جماعت اسلامی اور اسلامی جمہوری اتحاد کے ساتھ سیاسی حریفانہ چشمک تھی' اس لئے یہی لوگ ان کے خون کے پیاسے تھے ـــــ۔ مسٹر قادری نے اپنے ذاتی بیان میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ ان کے فقہ جعفریہ کے لوگوں کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں اور یہ کہ انہوں نے قادیانیوں کے خلاف مباہلہ میں شرکت کی آمادگی ظاہر کرنے کے باوجود انہیں ناراض نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ اسلامی جمہوری اتحاد اور جماعت اسلامی کے فدائیوں کی طرف سے ان پر حملہ کیا گیا۔ چونکہ مسٹر قادری رو در رو سوالات کے جوابات دینے سے انکار کرتے ہوئے کارروائی سے بھاگ گئے تھے' اس لئے رام کمار کے مقدمے کی مثال کے پیش نظر ان کے بیانات کو کوئی اہمیت نہ دی گئی۔

(۵) دوسرے مکاتب فکر کے لحاظ سے اس طرح کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں کہ مذہبی معاملات میں مسٹر قادری کے خیالات خاصے مختلف ہیں۔ مفتی غلام سرور قادری' جی ڈبلیو ۱۴' نے اپنے بیان میں کہا کہ مسٹر قادری قرآن پاک کی آیات مبارکہ کا ترجمہ غلط کرتے رہے ہیں۔ اور یوں انہوں نے خدائے عظیم و برتر پر کذب باندھا' انہوں نے کہا کہ مسٹر قادری احادیث مبارکہ کا ترجمہ بھی غلط کرتے ہیں۔ غلام سرور قادری نے اپنے بیان میں مزید کہا کہ مسٹر قادری نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے اپنے ادارے (ادارہ منہاج القرآن) میں زیر تعلیم طلباء کی تعداد بارہ ہزار بتائی جبکہ وہاں صرف سوڈیڑھ سو طلباء تعلیم حاصل کر رہے ہیں' انہوں نے ایک بار جمعہ کی نماز میں ۴۵ منٹ تاخیر کردی کیونکہ اس روز صدر ضیاء الحق اس مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے آ رہے تھے جہاں قادری صاحب خطیب تھے ـــــ۔ لیکن اگلے جمعے میں اس دانستہ تاخیر سے مسٹر قادری مکر گئے' انہوں نے پہلے تو ایک خاتون کے حکمران ہونے کی مذمت کی لیکن بعد ازاں اپنے بیان کے برعکس کردار ادا کیا' میاں نواز

شریف اور ان کے خاندان جس نے ان (قادری صاحب) کی ذات اور ان کے ادارے پر لاکھوں روپیہ خرچ کیا' کے اس احسان کا بدلہ جس انداز سے انہوں نے دیا' وہ بھی قابل مذمت ہے۔ ملک فیض الحسن 'جی ڈبلیو ۱۵' نے جن کے مسٹر قادری کے ساتھ گہرے تعلقات رہے ہیں اور جنہوں نے ادارہ منہاج القرآن کی تشکیل و تعمیر میں بنیادی کردار ادا کیا' اپنے بیان میں مسٹر قادری کو احسان فراموش 'ناشکرا' خود غرض 'جھوٹا' دولت کا پجاری 'خود پرست اور شہرت کا بھوکا انسان قرار دیا ہے۔ انہوں نے اپنے بیان مین تفصیل کے ساتھ کہا کہ کس طرح انہوں نے مسٹر قادری کی ابتدائی دنوں میں مدد کی 'انہیں میاں محمد شریف سے متعارف کروایا جنہوں نے مسٹر قادری کے بیرون ملک علاج و معالجے پر بھاری رقم خرچ کی 'بھارت میں ان کی اہلیہ کا علاج کروایا انہیں سیمنٹ کی ایجنسی نہ صرف لے کر دی بلکہ اس کے لئے نقد روپیہ بھی فراہم کیا۔ یہ نوازشات ان کے ادارے کو دی جانے والی ایک سو اسی (۱۸۰) کنال اراضی کے علاوہ ہیں۔ انہوں نے اپنے بیان میں مزید کہا کہ مسٹر قادری سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے بڑے بے قرار تھے۔ سیاست میں آنے کا انہیں انتہائی شوق تھا اور یہ کہ مذہب سے ان کی محبت محض ایک ڈھونگ ہے۔ انہوں نے اس بات کی شدید مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ مسٹر قادری پر سیاسی بنیادوں پر حملہ کیا گیا ہے کہ ان کی جماعت کی عملی اعتبار سے کوئی شناخت ہی نہیں ہے اور نہ ہی آج تک کسی ممبر پارلیمنٹ نے ان کی جماعت میں شرکت کی ہے 'اختر رسول شروع میں اس جماعت میں شریک ہوئے لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد اس سے نکل گئے۔ انہوں نے وضاحت کی کہ انہی بنیادوں پر انہوں نے کسی بھی ضمنی انتخاب میں نہ حصہ لیا اور سینٹ میں ان کی طرف سے کھڑے کئے گئے ایک امیدوار کو صرف تین ووٹ ملے۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ ان کی رہائش گاہ پر ہونے والی فائرنگ ان کے ذہن کی اختراع ہے تاکہ اس طرح شہرت حاصل کی جا سکے 'بالخصوص پیپلز پارٹی کے ذرائع کے ذریعے !

(۶) بدقسمتی سے یہ تمام شہادتیں مسٹر قادری کے بائیکاٹ کی وجہ سے بے چیلنج رہ گئیں۔ یہ ان کا نجی فیصلہ تھا۔۔۔ ان کی طرف سے پیش کئے گئے عذر نے کم از کم مجھے مطمئن نہیں کیا

۔ انہوں نے جلد بازی سے فیصلہ کیا لیکن متعلقہ معاملے میں اگرچہ ان کے بیانات کو خارج کر دیا گیا لیکن شہادتوں نے ان کے کردار کو خاصا نقصان پہنچایا ۔ ان کی طرف سے پیش کیے گئے عذر کے باوجود جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ انہوں نے کس انداز سے پیسہ اکٹھا کیا' ان ایسے عالم دین سے ایسی توقع نہیں کی جا سکتی تھی ۔ ان کی شاندار تعلیم' پیشہ وارانہ تفوق اور ابھرتے ہوئے عالم کی حیثیت تو ایک طرف' لیکن ان کے کردار کا یہ پہلو کمزور رہا جو ان ایسی مذہبی شخصیت سے کسی طرح بھی مطابقت نہیں رکھتا' کہ وہ اپنے ذاتی مالی معاملات میں ملک فیض الحسن پر انحصار کرتے تھے' مکان کا کرایہ تک ان کی طرف سے ادا ہوتا تھا' میاں محمد شریف ایسے سرمایہ دار کی مدد سے انہوں نے گھر خریدا' اپنے بیٹوں کے لئے سیمنٹ کی ایجنسی حاصل کی' اسے چلانے کے لئے ان کی مدد سے سیمنٹ خریدا' اپنے علاج کے لئے بیرون ملک گئے اور اہلیہ کا علاج بھارت سے کروایا' ان (میاں محمد شریف) کی گاڑیاں استعمال کرتے رہے' اور ان سے قرضہ بھی حاصل کیا۔ مفادات کے حصول کے لئے یوں لگتا ہے جیسے مسٹر قادری نے جھکنا نامناسب خیال نہ کیا لیکن مسٹر قادری کا رویہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ انہیں احسان شناسی کی قطعی کوئی پروا نہیں ۔ ان کے رویئے اور بیان میں شکر گزاری اور احسان شناسی کا قطعی کوئی عنصر نظر نہیں آتا۔ اس کے بجائے ان کے (مسٹر قادری) اور میاں محمد شریف کے درمیان' (ان کے بیانات کی روشنی میں یوں لگتا ہے جیسے) سخت دشمنی اور عناد کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ سانحہ کی کارروائی کا یہ "پس منظر" تھا۔ اور کسی بھی شخص سے زیادہ مسٹر قادری اس کی تخلیق کے ذمہ دار ہیں۔

(۷) قطعی سوال یہ تھا کہ آیا مسٹر قادری کی رہائش گاہ پر گولیاں برسانے کا عمل انہیں قتل کرنے کی ایک کوشش تھی ؟ شہادت کی روشنی میں' ان کے گھر کے گیٹ پر دو مسلح محافظ موجود تھے۔ جو اتفاق سے فائرنگ کرنے والوں کو نہ دیکھ سکے۔ یہ دعویٰ کیا گیا کہ حملہ اچانک گھر کے عقب سے کیا گیا اور یہ کہ حملہ آور ۲۶۱ بی سنبھالے متصلہ گھر کے غسل خانے کی چھت پر کھڑے تھے ۔ جائے وقوعہ کا نقشہ مختلف مقامات کے تعین کے لئے خاصا ممد و معاون ہے۔

چھوٹے سے غسل خانے کی چھت سے ۲۲ عدد خول اکٹھے کر کے دکھائے گئے۔ حتیٰ کہ کہا گیا کہ اس جگہ خون کی ایک خاصی مقدار بھی پائی گئی۔ پاؤں کے نشانات کے بارے میں دعویٰ کیا گیا کہ متصلہ گھروں ’۲۶۴ اے اور ۲۶۴ بی کی طرف جاتے ہیں۔ مسٹر قادری نے بذات خود دس عدد خول پولیس کے حوالے کئے (اگر مسٹر قادری کی رہائش گاہ بالخصوص ان کی خواب گاہ پیش نظر رہے تو یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ متصلہ دونوں گھروں کے غسل خانوں کی چھتوں سے مسٹر قادری کی خواب گاہ کو نشانہ بنایا جاسکے۔ دونوں مقامات کے درمیان خاصا فاصلہ ہے‘ اور یہ بھی کہ وہ مخصوص حصہ ان (قادری صاحب) کے صحن ’باورچی خانے‘ سے ڈھکا ہوا ہے ’لاؤنج اور سب سے بڑھ کر خواب گاہ کی دیوار کے پار وہ سو رہے تھے۔۔ ملک محمد اشرف‘ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور فورنسک سائنس لیبارٹری کے انچارج (سی ڈبلیو ٹو) کا بیان خاصا تجسس انگیز ہے۔ انہوں نے متعلقہ معاملے کا گہری نظر سے جائزہ لیا۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ مسٹر قادری نے بذات خود ان جگہوں کی نشاندہی کی جہاں جہاں گولیاں لگیں۔ رہائش گاہ کے اندر انیس کی تعداد تھی جبکہ بقیہ تین بیرونی مقابل دیوار پر ثبت تھے۔ انہوں نے "یہ" بات بھی بتائی کہ تین نشانات بیرونی دیوار کی باہر کی طرف تھے اور چار نشانات باورچی خانے کی بیرونی دیوار پر تھے جو گولیاں لگنے سے ثبت ہو گئے‘ بقیہ وہ نشانات جو مسٹر قادری کی خواب گاہ کی دیوار اور دروازے پر موجود ہیں "گولیوں کے نشان نہیں ہیں۔ اس کی وجوہات بیان کرتے ہوئے انہوں (ملک محمد اشرف) نے بتایا کہ وہ گولیاں جو متصلہ گھر کے غسل خانے کی چھت سے آ رہی تھیں ’ترچھی تھیں اور وہ تو اس قابل بھی نہیں تھیں کہ لاؤنج میں داخل ہو سکیں چہ جائیکہ وہ مسٹر قادری کی خواب گاہ کو جا لگتیں۔

اس نے لاؤنج کی اندرونی چھت پر ایک نشان دیکھا جو اس کے اندازے کے مطابق ملحقہ مکان کے غسل خانے کی چھت پر سے چلائی جانے والی گولی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ شیشے پر چلائی جانے والی ایک گولی کا نمونہ یہ ظاہر کرنے کے لئے لایا کہ وہ فرق واضح کیا جاسکے جو مسٹر قادری کی کھڑکی کے شیشے پر بنائے گئے نشان اور اصل گولی کے نشان میں ہوتا ہے۔ اس نے یہ

ثابت کیا کہ قادری صاحب کی کھڑکی کا نشانہ مصنوعی تھا کیونکہ اس سے شیشہ ریزہ ریزہ نہیں ہوا۔ یہ رائے بری ہو یا بھلی لیکن یہ ماہرانہ رائے تھی جو میرے فاضل پیش رو کے حکم پر حاصل کی گئی تھی اور گولیوں کے نشانات کی جگہ کی نشاندہی اور ان کی گہرائی کسی اور شخص نے نہیں بلکہ خود مسٹر قادری نے کی تھی۔ اگرچہ اس کی شہادت یک طرفہ تھی لیکن اس کے لئے مسٹر قادری کو تحقیقات سے علیحدگی اختیار کرنے پر خود کو الزام دینا چاہئے۔ ۲۲ نشانوں میں سے سات یا آٹھ نشانوں کو آتشیں اسلحہ کے نشانے قرار دیا جا سکتا ہے لیکن یہ بھی کلاشنکوف سے نکلی ہوئی گولیوں کے نشانوں کی باڑھ نہیں تھی۔ بلکہ یہ ایک ایک کر کے چلائی ہوئی گولیاں تھیں۔ ایک دشمن کبھی بھی یکے بعد دیگرے ایک ایک گولی چلانے پر اکتفانہ کرتا اور رات کے اس آڑے وقت میں تو اسے ۲۷ یا ۲۸ گولیاں چلانے اور ۶۲ء۷ قسم کے جدید ہتھیار کی میگزین خالی کرنے کی جلدی تھی۔ اس تاثر کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ موقعہ واردات سے بہت کم تعداد میں خول ملے ہیں۔ ۲۲ میں سے ۱۰ خول تو خود مسٹر قادری نے فراہم کئے۔ یہ ۲۲ خول غسل خانے کی چھت سے جمع کئے گئے تھے۔ مسٹر قادری کے گواہ قدرت اللہ (پی ڈبلیو ا) نے بتایا کہ خود اس نے تین میگزین خالی کئے اور ہر میگزین میں ۲۷ گولیاں تھیں۔ گویا اس نے جو گولیاں چلائیں، ان کی کل تعداد ۸۱ بنتی ہے۔ اس کے برعکس پولیس نے موقعہ پر صرف ۳۲ خول جمع کئے اور یہ ۸۱ گولیوں کی تعداد سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔

(۸) مسٹر قادری کا موقف ایک اور وجہ سے بھی متزلزل ہو جاتا ہے۔ دس خول میں سے جو مسٹر قادری نے پولیس کو پیش کئے، ان میں سے چار کو فارنسک ایکسپرٹ نے مسٹر قادری کی کلاشنکوف سے متعلق بتایا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دشمن نے موقع پر سب خول نہیں چھوڑے۔ مزید برآں چھت پر سے ۲۲ خولوں کی برآمدگی ناممکن تھی کیونکہ فارسینک ایکسپرٹ نے بتایا کہ گولیاں ۳۰ تا ۳۵ فٹ کے فاصلے سے چلائی ہوئی لگتی تھیں۔ اس چھوٹے سے غسل خانے کی چھت ۹ - ۷ فٹ کے فاصلے پر جائیں ---- یعنی یہ ملحقہ مکان کے صحن میں جا کر گرتیں، اور ان میں سے کوئی گولی بھی چھت پر نہ ملتی۔ اس لئے

انہیں چھت پر سے بر آمد کرنا تکنیکی طور پر غلط ہے۔ دوسری مشتبہ بات چھت پر سے خاصی تعداد میں خون کی دستیابی اور پھر اس خون کے نشانات کی لکیر کا ساتھ کے دو تین مکانوں تک چلتے جانا۔ کیمیائی معائنہ کرنے والے نے بتایا کہ یہ خون جما ہوا نہیں تھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ خون ادویات کیمیائی اجزا سے بنایا گیا تھا تاکہ اسے محفوظ رکھا جا سکے۔ دو یا تین مکانوں تک جانے والے خون کے نشانات اتنے لمبے تھے کہ انہیں کوئی زخمی شخص اپنے پیچھے اتنی دور تک نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر اسے جلدی واپس جانا تھا تو خون کی لکیر مقدار میں چھوٹی ہوتی۔ پھر سوال یہ بھی ہے کہ زخمی شخص دائیں طرف دیوار پر دیوار کیوں پھلانگتا چلا گیا ۔ مکان نمبر ۲۶۱ سے باہر نکلنے کا آسان ترین رستہ تو اس کا صدر دروازہ تھا۔ لیکن یہ دروازہ استعمال ہی نہیں کیا گیا۔ اس بات کا جواز بھی درکار ہے کہ حملہ آوروں نے فرار ہونے سے پہلے متعدد مکانوں کو عبور کرنا کیوں مناسب سمجھا۔ یہ غیر معمولی بات اس کہانی کو غیر معتبر کر دیتی ہے۔

(۹) اگلا اہم نکتہ یہ ہے کہ کیا مقامی پولیس نے تحقیقات عمل میں لانے میں کوتاہی برتی ہے ؟
ایس ایچ او (جی ڈبلیو ۱) اور ڈی ایس پی (جی ڈبلیو ٹو) کی شہادت ظاہر کرتی ہے کہ تحقیقات کے معیار پر کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ تھانیدار کو تحریری شکایت مسٹر قدرت اللہ (پی ڈبلیو ٹو) نے دی اور اس نے خواہش کی کہ مسٹر قادری سے بھی اسی بارے میں دریافت کیا جائے لیکن انہوں نے خود (مسٹر قادری) اس قسم کے تعاون سے گریز کیا۔ ڈی ایس پی نے بھی اس کیس کی جزوی تحقیقات کے علاوہ پولیس گشت میں اضافہ کر دیا انہوں نے خول جمع کیئے۔ خون آلود زمین حاصل کی۔ موقع کا نقشہ تیار کیا۔ الیکٹرک ٹیسٹر حاصل کی اور اس چالان کی تکمیل کے لئے دیگر کارروائی کی لیکن وہ مسلسل شکایت کرتے رہے کہ مسٹر قادری نے ان سے تعاون نہیں کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک مہمان محمد افضل گھر میں موجود تھا وہ اس سے بھی تحقیقات میں مدد حاصل کرنا چاہتے تھے تاکہ کچھ متعلقہ معلومات حاصل ہو سکیں۔ لیکن اسے غائب کر دیا گیا اور پھر کبھی تحقیقات افسر کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ جس کی وجوہ

صرف مسٹر قادری کو معلوم ہیں۔ خول فارسینک سائنس لیبارٹری کو بھیجے گئے اور خون آلود مٹی بھی معائنے کے لئے ارسال کی گئی۔ فارسینک ایکسپرٹ کی رائے قادری صاحب کے کیس میں معاونت نہیں کرتی۔ ان کی رائے مجموعی طور پر یہ ہے کہ قادری صاحب کے گھر پر جو نشانات ہیں 'وہ مصنوعی طریقے سے بنائے گئے ہیں' خون کے کیمیائی معائنے نے بھی ظاہر کیا کہ موقعہ پر کسی کو گولی نہیں لگی کیونکہ اس خون میں قدرتی خون کی طرح جمے ہوئے عناصر نہیں تھے۔

چوہدری ریاست علی ایڈووکیٹ (پی ڈبلیو ۹) نے یہ دریافت کرنے کی ناکام کوشش کی کہ ان دنوں مختلف مقامی ہسپتالوں میں کہیں کوئی شدید زخمی داخل ہوا ہے ؟ پولیس مقامی ہسپتالوں میں کسی شدید زخمی کے داخلے کا سراغ نہ لگا سکی۔ نتیجتاً واقعات کو گھڑنے کی بات درست تھی اور مسٹر قادری کے خلاف رائے کو تقویت ملتی تھی۔

(۱۰) ہم نے قرب و جوار میں رہنے والے لوگوں سے بھی تحقیقات کی۔ اس سلسلے میں ملحقہ مکان نمبر بی ۔ ۲۶۱ ماڈل ٹاؤن ایکسٹینشن لاہور کے مالک کا معائنہ کیا گیا۔ اس شخص کے مکان کے غسل خانے کی چھت سے مسٹر قادری کے مکان پر مبینہ طور پر گولیاں چلی تھیں۔ تاہم اس نے کہا کہ میں نے اپنے غسل خانے کی چھت سے کسی کو گولیاں چلاتے ہوئے نہیں دیکھا' اگر گولیاں سوا ایک بجے سے سوا دو بجے تک چلتی رہی تھیں تو اس آبادی کے باشندگان اور بالخصوص ملحقہ مکان کے مالک (جی ڈبلیو ۵) تو حملہ آوروں کو ضرور دیکھتے۔ یہ امر بھی اس واقعے کی صداقت کو مشتبہ بناتا ہے۔

(۱۱) مقامی پولیس کی تحقیقات سے غیر مطمئن ہو کر مسٹر قادری نے ایف آئی اے کے پاس ایک اور شکایت درج کرائی۔ مشتاق احمد بنام ایس ایچ او پولیس اسٹیشن مناواں لاہور (پی ایل جے ۱۹۸۴۔ کرمنل سی '۲۔ ۳۷۔ ڈی بی) ایک واقعے کے بارے میں دوسری یا اس کے جوابی درخواست دائر نہیں ہو سکتی۔ مزید برآں سیکشن ۳ کو اگر ایف آئی اے ایکٹ ۱۹۷۴ء کے شیڈول کے ساتھ پڑھیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ ۳۰۷ پی پی سی کے کیس میں ایف آئی اے دخل

انداز نہیں ہو سکتا فاضل ایڈووکیٹ جنرل کا یہ موقف درست معلوم ہوتا ہے اس کے پاس کیس درج کرانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ صوبائی حکومت سے بالادستی حاصل کریں۔ یہ اقدام معمول کی شکایت کے برعکس سیاسی نوعیت رکھتا ہے۔ تحقیق اگرچہ گواہ (جی ڈبلیو ۱۶) کے مطابق کرائم برانچ ہی کر رہی تھی۔ لیکن متذکرہ تصور بے داغ نہیں ہے۔ پولیس تحقیقات میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ خصوصاً اس صورت میں جب کہ یہ خیال تقویت حاصل کر رہا تھا کہ مسٹر قادری عدم تعاون کر رہے تھے۔

(۱۴) فاضل ایڈووکیٹ جنرل نے متعدد دوسرے نکات بھی پیش کئے جن کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ وقوعہ حقیقی نہیں تھا۔ شہادت یہ بھی پیش کی گئی کہ مسٹر قادری اور ان کے رفقاء نے ایک ہتھیار دار جلوس نکالا تھا اور دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی تھی۔ چنانچہ ان کے اسلحہ کے لائسنس منسوخ کرنے کا معاملہ چل رہا تھا۔ ایڈووکیٹ جنرل کی رائے میں اسلحہ لائسنسوں کو بچانے کے لئے بھی متذکرہ واقعے کا ڈھونگ رچایا جا سکتا تھا اور یک طرفہ کارروائی اس موقف کو بڑی حد تک ثابت کرتی ہے۔ اس وقوعہ کو عمل میں لانے کی دوسری وجہ شہرت اور تشہیر حاصل کرنا بھی ہے جس کے مسٹر قادری شدید خواہش مند ہیں کہ اپنے آپ کو مریض قرار دینے سے بھی گریزاں ہیں۔ اس بات پر اصرار کیا گیا کہ جب میاں محمد شریف نے انہیں دولت کے بے پناہ وسائل فراہم کر دیئے تو مسٹر قادری جو اس میدان میں نہتے تھے۔ قناعت نہ کر سکے انہوں نے میاں محمد شریف ہی کے خلاف محاذ کھڑا کر دیا حالانکہ وہ ان کے محسن تھے۔ ان (مسٹر قادری) کا معیار زندگی اچانک بلند ہو گیا ہے اور یہ ان کے ذرائع آمدن سے غیر متناسب ہے۔ فاضل ایڈووکیٹ جنرل کا خیال ہے کہ انہوں نے (مسٹر قادری) نے آئی جے آئی اور پیپلز پارٹی کے اختلافات کو ایکسپلائٹ کیا اور پی پی پی سے اس کی بہت بڑی قیمت وصول کی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مرکزی حکومت نے آسانی سے ان کی ایف آئی آر درج کر لی۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ مسٹر قادری کی درخواست (ایف آئی اے) کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ اس کے علاوہ اس انکوائری میں وکلاء کے اس گروہ کی طرف بھی توجہ دلائی گئی جو مسٹر

قادری کی مدد کر رہا تھا۔

راجہ محمد انور ایڈووکیٹ وغیرہ جیسے کئی افراد دلیل تھے، جن کی وابستگیاں پیپلز پارٹی کے ساتھ ڈھکی چھپی نہیں۔ پھر یہ دلیل لائی گئی کہ پیپلز پارٹی کو اپنی سرگرمیوں میں مذہبی رنگ بھرنے کیلئے کسی مذہبی آدمی کی ضرورت تھی، جو ان کو جناب قادری کی شکل میں بڑی آسانی سے مل گیا جو مواقع کے حصول کیلئے اپنی تیزی کے باوجود اسلامی جمہوری اتحاد اور اس کی لیڈر شپ کو ضرر پہنچانے کے لئے پیپلز پارٹی کے بہترین مددگار بن سکتے تھے۔ مندرجہ بالا نکات میں ہر ایک اپنی جگہ کچھ وزن رکھتا ہے۔ اور مقدمہ کے خاص حالات میں انہیں بالکل ہی بے غفلت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان میں سے ہر ایک نکتہ کو جناب قادری کے خلاف نتیجہ خیز بنانے کیلئے مناسب مواد موجود تھا۔ ایک گواہ نے انکشاف کیا کہ جناب قادری کے پاکستان پیپلز پارٹی کی اعلیٰ قیادت کے ساتھ بے تکلفانہ تعلقات تھے کہ یہ مقدمہ ایک ایسی ایجنسی کے ہاں بھی رجسٹر ہو جو کہ اختیار سماعت کی مجاز نہ تھی۔ اگرچہ انہیں وکلاء کے پینل کی مدد حاصل تھی، پھر بھی ایسے اشارات موجود تھے جیسے وہ اسلامی جمہوری اتحاد کی قیادت کو ضرر پہنچانے سے پوری طرح باخبر ہیں۔

(۱۳) آخری نکتہ جناب قادری کی ذہنی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔ ان کے خوابوں کا حوالہ دیا گیا جو سر دن نہیں دیکھے گئے تھے۔

(۱۴) ان تمام وجوہ کی بنا پر میرے جوابات بحوالہ حالات درج ذیل ہیں:

(i)(ii)(iii) بیان کردہ فائرنگ، حقیقی واقعہ نہیں تھا۔

(iv) مسٹر قادری کا نقصان ان کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

(v)(a) مقامی انتظامیہ نے ہر ممکن طریقے سے صورتحال میں اپنا ضروری کردار ادا کیا۔

(v)(b) ان کے ہمسایوں میں سے کوئی شخص اس واقعہ میں ملوث نہیں تھا۔

(vi) مقامی پولیس نے مقدمہ کی تفتیش کے لئے مناسب اقدامات کئے تھے۔

(vii) برق رفتاری سے کی گئی تفتیش کے دوران میں کوئی خصوصی ہدایت نہیں دی جا

سکتی تھی۔ یہ پولیس اور کرائمز برانچ کی ذمہ داری تھی کہ وہ جلد از جلد مقدمے کو نمٹائے۔ بہرحال مسٹر قادری کے حفاظتی انتظامات کو ایک سے زائد وجوہ کی بنا پر مزید بہتر بنایا جا سکتا تھا۔

(viii) مسٹر قادری نے کارروائی کا بائیکاٹ کر دیا لیکن اپنی پریس کانفرنس میں انہوں نے اس بارے میں تبصرہ بازی میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ بالخصوص گواہان ملک فیض الحسن اور مولانا غلام سرور قادری کو ناقابل اعتماد قرار دیا۔ اصرار کیا گیا کہ ان کے بعض خواب آنحضورؐ کی شان میں گستاخی کے مترادف ہیں (مثلاً یہ کہ) انہوں نے دعویٰ کیا کہ ایک خواب میں آنحضورؐ نے ان سے فرمایا کہ ان کی عمر ۳۳ برس سے بڑھا کر ۶۶ برس کر دی گئی ہے لیکن پھر ان کے اعتراض پر کہ ان کی عمر آنحضورؐ کی اپنی عمر سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے ۔ چنانچہ عمر کم کر کے ۶۳ سال کر دی گئی۔ ان کے اس لایعنی طرز عمل سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ مسٹر قادری ذہنی طور پر ایک بیمار آدمی ہیں' اس لئے وہ اپنے دشمنوں سے جو کوئی بھی ہو سکتے ہیں' حد درجہ خوفزدہ ہوئے بلکہ "دشمن فوبیا" میں مبتلا ہو گئے۔ لیکن ان دلائل کو آسانی سے زیر بحث لایا جا سکتا تھا۔

یہ واقعہ کہ مسٹر قادری اپنے مخصوص خوابوں کو بیان کرنے کیلئے بے قرار رہتے ہیں یا ان کے غیر صحت مندانہ ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کو خواب آتے بھی ہوں۔ لیکن ان کے تعصبات کو بھی بالکل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جبکہ وہ اپنے خوابوں کو ایک خاص انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اور اپنی شخصیت کو ایک خاص رنگ دیتے ہیں اس ذہنی ساخت کی حامل شخصیت سے ہر چیز ممکن ہے۔ نصف رات کے سمے ان پر مسلح آدمیوں کے حملے کے ڈرامے کو بھی اس میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ آرڈیننس میں ٹریبونل کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ اپنی توہین پر کوئی سزا دے سکے (قانون میں) اس خلاء کی بنا پر میرے فاضل پیش رو جسٹس فضل کریم نے انکوائری کو مزید آگے بڑھانے سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔ مزید یہ کہ انکوائری کے دوران جناب قادری نے عدالت کے اندر اور باہر سخت تنقید کی

- ان خامیوں کے ازالہ کے لئے آرڈیننس میں مناسب ترامیم کی ضرورت ہے۔

دستخط اختر حسن جج یک رکنی ٹریبونل مورخہ ۹۰ / ۸ / ۸